عہدِ حاضر کی تہذیبی کش مکش میں اکبر الٰہ آبادی کی معنویت

خالد امین

Civilizational conflict among the nations of the world is such a grave issue which needs to be discussed among intelligentsia. Today's post-modern arena possesses such invaluable characteristics which not only decides the due course of the modern man, but also invites the society to act upon. The day by day changing values of society make mankind an interchangeable animal who is only following the goal of pleasure-seeking liberty and freedom. Such kind of debates have been discussed in Akbar's poetry and he not only questioned the craft of western civilization but also placed some question marks on it. We may see the aftermath of colonialism in the south Asia that how the clash of civilizations has happened within such a minute time period. This is the versatility of Akbar's poetry that it takes the mind to the humorous pattern and impacts it with serious and necessary issues regarding life such as evolution, modern values, spiritualism, relation between man and God and somehow to the question of ontology as well. This article traces down the poetic impression of Akbar into many dimensions that how he addressed the upcoming wave of west within the domain of Urdu humorous poetry.

اکبر کی شاعری اور ان کا تہذیبی زاویہ نظر ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے کہ اپنی کھوئی ہوئی ثروت بخش اقدار کی بحالی کے لیے کوشاں ہو جائیں۔ یہ آواز وہ آواز ہے جو نہ صرف پاکستان و ہندوستان کو بلکہ سارے ایشیا کو زندہ رہنے اور خود کو از سرِ نو دریافت کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اکبر جیسا شاعر ایشیا کی کسی بھی دوسری زبان میں اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس نے مغربی تہذیب کے غلبے سے بچنے کے لیے جس دل چسپ اور دل کش انداز میں مشرقی اقدار سے پیوستہ رہنے کی تلقین کی ہے اس میں قوموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی بقا کا راز مضمر ہے۔

اس لیے ہمیں اکبر کو صرف مزاحیہ شاعر نہیں بلکہ جدید فلسفی شاعر کے انداز میں دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔[۱] اکبر نے نہایت بے باکی سے وجدان (intuition) کی سطح پر اپنی تخلیقی بصیرت کے ذریعے مغربی فکر کے عیوب سے ایشیائی قوموں کو روشناس کرایا۔ اکبر کی ہنسی یا اس کا طنز اس جذبہ افتخار اور احساسِ برتری سے جنم لیتا ہے جس میں مغربی تہذیب کی کم زوریاں شامل ہیں۔ وہ مغربی فکر کی بدصورتی دیکھ کر دردانگیز ہونے کے بجائے ہنس دیتے ہیں۔[۲] مزید دہرا اور وضع مغربی کو اپنانے والے انسان ان کے نزدیک مشرقی تہذیب کی قوت سے لاعلم ہیں۔ اکبر کی شاعری کی ذہانت اسی لاعلمی کی تہذیبی قوت وثروت کا نمونہ ہے

ارادے اور ذہن کی تمام تر قوت اور نیک نیتی کے باوجود سرسید اور دورِ حاضر کے جدیدیت پسند یا پھر تہذیبی کش مکش کے حصے داروں کے پاس وہ ساز و سامان اور صلاحیت موجود نہیں کہ وہ چھان بین کر کے مذہبی عقیدے اور مغربی نظریات کے مابین امتزاج پر مبنی ذہنی نظام قائم کر کے دکھا سکتے[۳] لہٰذا اکبر کا مطالعہ اس دور میں بھی درست معلوم ہوتا ہے کیوں کہ انھوں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ان دو تہذیبوں کا مشترکہ لائحہ عمل زندگی کے کاروبار کو رواں رکھنے کے لیے بن ہی نہیں سکتا۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ مغرب کے نظام افکار میں جس تصورِ کائنات کی کارفرمائی ہے اسے مسلم دنیا دانش وری کی سطح پر اپنا ہی نہیں سکتی۔ اکبر نے سید سلیمان ندوی کے اشعار کو معنیِ بحرِ حقیقت سے تعبیر کیا ہے[۴] لیکن یہ بات خود اکبر کے اشعار پر صادق آتی ہے۔

اکبر نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکمت عملی اس بات پر مبنی ہے کہ جدید سائنسی فکر کو ہندوستان میں نافذ ضرور کیا جائے لیکن وہ ذہنی اعتبارات سے نو آبادیاتی ڈھانچے میں ڈھلا ہو اور یہاں کے لوگ اسے تحسین کی نظروں سے دیکھیں۔ تیسری دنیا کے لوگ ان جدید ترین علوم کو حاصل کرنے کے خواہاں ہوں تو انھیں مغربی فکر کو ہر حال میں اپنانا پڑے۔[۵] انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں اکبر اور اقبال کے سوا شاید ہی کوئی دوسرا فرد ہوگا جس پر مغرب کے نظامِ فکر کی یہ جہتیں نمایاں ہوئی ہوں گی۔[۶]

یہ باتیں آج کل فیشن کے طور پر مقبول ہیں کہ مغرب کی مابعد نو آبادیاتی اقدار و تصورات کرونا (Corona) جیسی وبا کے بعد نہایت شد و مد سے تیسری دنیا کی تہذیب کو اپنا محکوم بنا رہی ہیں۔ فیشن کے طور پر کہی جانے والی یہ بات اتفاق سے ہم جیسے ملکوں کے لیے اپنے اندر بڑی صداقت رکھتی ہے۔ اہلِ مغرب کے دانش ور اس بات کے خواہاں ہیں کہ تیسری دنیا کے لوگ ہماری تہذیب، اقدار اور اطوار کو تا حدِ امکان قبول کر لیں۔ اسی لیے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں کینیڈا کے وزیرِ اعظم لیسٹر پیئرسن (Lester Pearson) نے اپنی کتاب *Democracy in politics* میں خبردار کیا کہ:

انسان ایک ایسے زمانے میں داخل ہو رہا ہے جہاں مختلف تہذیبوں کو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو پُر امن

لین دین کے ساتھ ایک دوسرے سے سیکھتے ہوئے، ایک دوسرے کی تاریخ اور آدرشوں اور فن و ثقافت کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کی زندگیوں کو زرخیز بناتے ہوئے زندگی بسر کرنا سیکھنا ہوگا۔ اِس پر ہجوم چھوٹی سی دنیا میں دوسرا راستہ کشیدگی، تصادم اور آفات کا ہے۔ امن اور تہذیب دونوں کے مستقبل کا انحصار دنیا کی بڑی تہذیبوں کے سیاسی و روحانی اور علمی رہ نماؤں کے درمیان افہام و تفہیم اور تعاون پر ہے۔[۷]

اس کے برعکس سیموئل پی ہنٹنگ ٹن (Samuel P. Huntington) اسلامی معاشرے کی جدیدیت کاری پر سوال اٹھاتے ہوئے کہتا ہے کہ مسلم معاشروں کے برعکس اور دیگر مشرقی معاشرے جدیدیت کی جانب جلد اور زیادہ آسانی سے پیش رفت دکھاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مسلم معاشروں کی بہ نسبت دیگر قومیں مغربی ٹیکنالوجی درآمد کرنے اور اس سے اپنی موجودہ ثقافت کو زرخیز بنانے کے لیے استعمال کرنے میں زیادہ کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ اس پر مزید کہتا ہے کہ کیا دیگر قومیتوں کی طرح مسلم معاشرے کو جدیدیت اپنانی چاہیے یا اس کی مخالفت کرنی چاہیے۔[۸] سیموئل پی ہنٹنگ ٹن کا یہ خیال ہے کہ جدیدیت کے ساتھ آنے والی تبدیلی کے بارے میں اسلامی شریعت کچھ نہیں کہتی جب کہ مغربیت کے نام سے اسلامی دنیا میں ردعمل پایا جاتا ہے۔ مثلاً زراعت، صنعت یا گاؤں سے شہر کی طرف لوگوں کی منتقلی یا سماجی استحکام کے نئے انداز اختیار کرنا جس میں فرد کی اجتماعی زندگی زیادہ محفوظ و مامون ہو۔ یہ ساری چیزیں اگر اسلامی معاشرے میں جدیدیت کی فکر کے ذریعے انجام پارہی ہیں تو اس کے خلاف اسلامی معاشرے میں مزاحمت کم زور ہے۔[۹]

تہذیبی کش مکش سے واقفیت رکھنے والے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جدیدیت کا لازمی مطلب مغربیت نہیں۔[۱۰] اکبرالٰہ آبادی مغرب کے اس بنیادی نکتے سے اچھی طرح واقف تھے۔ اکبر کا یہ خیال تھا کہ مغربی معاشرے میں پنپنے والی نظریاتی اور فکری تحریکیں مسلمانوں میں اپنی تہذیب و ثقافت کی گرفت کو لامحالہ کم زور کریں گی۔ ہم مغربی اقدار، اداروں اور رواجوں کو اپنائے بغیر مغربی فکر یا جدیدیت کے حامل نہیں بن سکتے۔ مشرقی تہذیب و تمدن کی علامات جدیدیت کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہیں۔ اکبر نے یہاں تک کہا کہ آلات و سائل میں ترقی اور تبدیلی کے ساتھ ساتھ تجارت اور زندگی گزارنے کے طریقوں میں ''ترقی'' اور ''تبدیلی'' ہماری اقدار اور روایت کے لیے نہایت مضر ہے۔ انھوں نے صاف الفاظ میں کہا کہ مغربی نظام زندگی میں انسان زندہ رہتا ہے لیکن نشاطِ زندگی سے محروم۔ اس تہذیب کی چکا چوند اصل میں دل اور ذہن میں ناتوانی، بے کسی، دل شکستی اور بانجھ پن کی کیفیات پیدا کرتی ہے۔ اکبر نے اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے کہا کہ:

......اب تو جناب اغیار کیا معنی آپس میں ہی ایسی شفقتوں کے اظہار کا خیال کم ہے۔ ایک ایک بادۂ خود پرستی میں محو و سرشار ہے کونسل اور کمیٹی اور کوتوالی اور اخبار موجود ہے۔ پھر آپس میں محبت بڑھانے، بھائی چارہ

کرنے کی کیا ضرورت ہے۔[۱۱]

اس کے باوجود ہمارے معاشرے میں مغربی نظریاتی فکر کو اپنانے والوں کا یہ خیال ہے کہ ہم مغربی نظام کے ساتھ اسلامی اقدار اور اس کے بنائے گئے نظامِ حیات پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں اکبر نے اس عمل کو دامِ فریب کہا ہے۔ اکبر نے صاف الفاظ میں کہا کہ:

انگلش ڈرس انور کا جو کل بزم میں دیکھا
اکبر نے کہا یہ تو خرابی کے ہیں آثار
معنی میں بھی ہو جائے گا آخر کو تغیر
تبدیلیٔ صورت کے رہے گر یہی اطوار
خالق کی عبادت سے حجاب آنے لگے گا
شرماؤ گے کرتے ہوئے اسلام کا اظہار[۱۲]

مغربی نظام زندگی دل کو خالق کی طرف جھکا ہی نہیں سکتی۔ اقتصادی، معاشرتی اور تمدنی امور میں اسلام اور جدیدیت باہم متصادم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی معاشرے میں مغربی اصول سیاست و معیشت کی بالا دستی نے مذہبی تحریکوں کے اثرات کو کئی سطحوں پر کم زور کر دیا ہے۔ مغرب کی سیاسی بالا دستی کے خلاف آواز تو بلند ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے لیکن مغرب کے جدید نظام فکر کی ادارتی ترتیب میں ہم کافی حد تک اس کے ہم رکاب ہیں۔ جدید دور میں مغربی فکر کو اپنانے کے نتیجے میں ہمارے ذہن کو اس طرح Condition کر دیا گیا ہے کہ ہم کامل یقین کے ساتھ خدا کو ماننے کے عمل کو علمی بنیاد پر Justify ہی نہیں کر پا رہے ہیں بلکہ جدید ذہن میں خدا کی مرکزیت گم ہو گئی ہے۔ مغربی نظام فکر نے انسانی ذہن کو ایک ایسے ماحول میں پہنچا دیا ہے جہاں تصدیق کے تمام ذرائع مادیت سے وابستہ ہو گئے ہیں۔

اب ہم مغربی نظام زندگی کی نشاط آمیز لذت میں سرشار ہیں۔ اس پورے عمل نے اسلامی تہذیب کے اصول ومبادیات کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ذہنوں کا سانچہ ہی بگڑ گیا ہے۔ اسلامی انداز میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہے، مغربی نظامِ تعلیم کے نتیجے میں مغربی تہذیب کے اصول ومبادی پر اعتقاد رکھنے والے دانش وروں نے اسلامی معاشرے میں اپنی جڑیں مضبوط بنالی ہیں۔[۱۳] ایسی صورت حال میں اکبر کا بنیادی موقف نہایت سادہ ہے وہ بلا خوف اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہماری موجودہ نسل جس عہد حاضر میں جس فلسفہ اور سائنس کی آغوش میں پرورش پا رہی ہے اس کی بنیاد، دہریت، الحاد اور مادہ پرستی ہے۔ اس کی شہادتیں اہل مغرب کے فلسفی اور اسکالرز پیش کرتے رہے ہیں۔ رینے ڈیکارٹ (Rene Descartes) جیسا فلسفی بھی ایک جانب خدا کا قائل ہے تو دوسری طرف اس کائنات کے ارتقا کی میکانکی وجوہات تلاش

کرتا رہتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

مجھے اپنی آنکھیں بند کر لینی چاہئیں، مجھے اپنے تمام حواس کو خیر باد کہہ دینا چاہیے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے ذہن سے ماڈی چیزوں کے تمام نقوش مٹادوں، یا کم از کم (کیوں کہ یہ کام بہت مشکل ہے) ان چیزوں کو جو ماڈی نوع کی ہیں انھیں جھوٹا قرار دے دوں۔ میں صرف خود سے بات چیت کرنا اور اپنی فطرت پر غور کرنا چاہتا ہوں تا کہ میں اپنے وجود کا بہتر فہم حاصل کرلوں۔ لیکن میں ایک شئے ہوں جو سوچتی ہے یا دوسرے لفظوں میں اس کی صراحت کروں تو ایک ایسا وجود ہوں جو شکوک اور شبہات میں مبتلا ہے۔ میں تسلیم کرسکتا ہوں، رد کرسکتا ہوں ان چیزوں کے بارے میں جن کا مجھے علم ہے میں کئی چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہوں[جو محبت کرتی ہے جو نفرت کرتی ہے] جو خواہش رکھتی ہے جو تمنا رکھتی ہے جو تصور میں ہے جو ادراک میں دیکھی جاسکتی ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔

اس کے باوجود میں جن چیزوں کا تصور رکھتا ہوں اور جن کا ادراک مجھے حاصل ہے وہ دراصل میں ہی ہوں اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ فکر کے یہ پہلو جنھیں میں تصور اور ادراک کہہ رہا ہوں یہ مظاہر بھی مجھ میں ہیں۔[۱۴]

انسانی ذہن کے روحانی اور ماڈی تقابل کی بنیاد جسے ڈیکارٹ نے شروع کیا تھا[۱۵] اس پر اکبر الٰہ آبادی کہتے ہیں کہ:

خدا کی ہستی میں شبہ کرنا اور اپنی ہستی کو مان لینا
پھر اس پہ طرّہ اس ادّعا کا ہم ہیں اہل شعور ایسے[۱۶]

سوئے مسجد اس نئی تہذیب کی راہ کہاں
تھینک یو میں صرف ہیں الحمدُ للہ اب کہاں[۱۷]

دل میں اب نورِ خدا کے دن گئے
ہڈیوں میں فاسفورس دیکھیے[۱۸]

رینے ڈیکارٹ کی اس فکر کے نتیجے میں تصدیق کے مادی ذرائع پر نوع انسانی کا بھروسا بڑھ گیا جس نے مغربی معاشرے کو بالخصوص اور جنوبی ایشیا کی اقوام کی علمی سطح پر کئی عجیب وغریب اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان میں ایک اثر افادیت پسندی (Utilitarianism) کا ہے۔ اکبر نے ہر موقع پر اس فلسفیانہ طرز زندگی کی مخالفت کی۔ اکبر کا خیال تھا کہ مغربی علم و دانش پر یقین رکھنے کی وجہ سے ہر چیز، ہر خیال، ہر عمل دنیاوی پیمانے اور نفع و نقصان کی کسوٹی پر پرکھی جائے گی۔ اکبر کہتے ہیں کہ:

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرا کرتی ہیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

بس اصل کارِ دیں تو صرف تسبیح و قناعت ہے
عوام الناس باہم جنگ کرتے ہیں زوائد پر[۱۹]
شغل زندگی کے ہیں قانون ہی کچھ اور
کیسی غزل یہاں تو ہے مضمون ہی کچھ اور
وہ جادوئے سخن ہے نہ وہ رنگ انجمن
تہذیب مغربی کے ہیں افسون ہی کچھ اور[۲۰]

اکبر نے واضح انداز میں Intimate کیا کہ مغرب ایک ایسے انسان کی صورت گری چاہتا ہے جو غیر مادی حقائق کو اپنی زندگی سے نکال دے۔ خدا اور انسان کے مابین آنے والے افادی نقطۂ نظر کو اکبر جیسے انسان نے نہایت قریب سے محسوس کیا۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ دل سے مذہبی اعتقاد کی ساخت گم ہو رہی ہے مذہب کے اخلاقی تصورات بے مصرف ہو رہے ہیں۔ یعنی اب مادی حقیقت ہی حقیقت کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ افادیت پسندی کا نظریہ اس زور وشور سے مانا گیا کہ مغرب تو کجا اہل مشرق کی تمام علمی، سیاسی، معاشی روایتیں اب اسی نظریے کی تصدیق کے لیے اپنے بیانیے کو تبدیل کر رہی ہیں۔ اس تبدیلی کا ایک نفسیاتی رخ بھی ہے اور وہ یہ کہ اس نے انسان کو حصول مسرت میں مبتلا کر دیا ہے موجودہ دور کا انسان تمام تر خواہشات کی آبیاری اس لیے چاہتا ہے کہ وہ بس خوش رہے یعنی Pleasure Seeking ہو اور وہ بھی ایسی مسرت آمیز زندگی جو اس کی نفسیاتی اور نفسانی خوشی کے تمام تر ذرائع پر پورا اترے اس پورے عمل کو اپنانے کے بعد کون سا ایسا انسان ہوگا جو ''آزادی'' کے تصور پر ایمان نہ لائے۔ ایسے میں اکبر کے اس لطیفے میں پنہاں معنویت اور زیادہ روشن ہو جاتی ہے:

ایک صاحب نے اپنے شائستہ وتعلیم یافتہ لڑکے کی تعریف میں فرمایا کہ حضرت ماشاءاللہ یہ کرنسی نوٹ ہے۔ جہاں پہنچا، روپیا لایا، ایک صاحب خوشامدی بیٹھے تھے بول اٹھے کہ بجا ہے کہ پیر و مرشد، اگر کوئی دختر نیک اختر ہوتی تو چشم بددور بل آف ایکسچینج ہوتی۔[۲۱]

ایک اور جگہ اس کی مثال اکبر نے یوں دی ہے آزادی پر بحث کرتے ہوئے کہنے لگے کہ:

بالکل، غلط انسان ''آزاد'' ہے ہی نہیں، یہ سانس لینا ایک قید اور پابندی ہے انسان کے لیے......اگر ''آدم زاد'' سے ''دال'' اور ''میم'' کے الفاظ نکال کر اس کا ''دم'' نکال دیا جائے تب ہی وہ آزاد ہو سکتا ہے۔ نباتات کا بھی یہی حال ہے جب تک سر نہ کٹے آزاد نہیں ہوتے۔ مثلاً (TREE) (پیڑ) کا سر کاٹو (T) ٹی۔ ایف (F) بن جائے گا۔ اس کے بعد REE کے ساتھ ملاؤ تو (FREE) فری ہو جائے گا یعنی آزاد۔[۲۲]

مغرب کی اس آزادانہ جدیدیت کے بارے میں صرف اکبر جیسا دانش ور آواز بلند نہیں کر رہا تھا بلکہ خود

مغرب میں اس آزاد خیالی کے بارے میں اب گہری تشویش پائی جاتی ہے۔ رابرٹ پپن (Robert Pippin) لکھتا ہے کہ ''جدیدیت نے ہم سے ایک ایسی ثقافت کا وعدہ کیا تھا جس کے زیر سایہ لوگ خوف سے آزاد، معقول، مائل بہ جستجو اور خود کفیل ہوں گے لیکن ہمیں اس نظامِ فکر کے ذریعے ایک ریوڑ نما معاشرہ ملا، جس کے افراد حیراں و سرگرداں، ڈرپوک، مقلد اور خوف زدہ ہیں''۔[۲۳] ڈکن ولیمز (Ducan Williams) نے اپنی کتاب *Trousered Apes- Sick literature in a sick Society* میں لکھتا ہے کہ ''مغربی دنیا اور اس کی تہذیب و ثقافت تشدد اور انسانیت سوز درندگی و حیوانیت سے لبریز ہو چکی ہے''۔[۲۴] میکس ویبر (Max Weber) تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ جدیدیت افسر شاہی عقلیت پسندی کا آہنی پنجرہ ہے جس نے ہمارے اس جدید دور کی زندگی کے ہر پہلو کو گرفت میں لیا ہوا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ آہنی پنجرہ اس قابل نہیں کہ اس میں محبوس رہ کر زندگی گزاری جائے اس کا اندازہ ہے کہ آنے والی اس بے مہار ترقی کے اختتام پر بالکل نئے مصلحین اور مبلغین سامنے آئیں گے اور پھر نئے تصورات اور نظریات کو دوبارہ حیات نو ملے گی۔[۲۵]

اس تناظر میں اکبر کی معنویت ہمارے لیے نہایت اہم ہے کیوں کہ جن لوگوں نے اکبر پر ''ترقی'' مخالف ہونے کا الزام لگایا تھا آج وہ خود اپنی قبا کو چاک ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ فکری خلجان میں مبتلا ہیں۔ اکبر کی اشارہ کردہ کیفیات کا اس دور میں ہم نہایت قریب سے مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے لسان العصر اکبرالہ آبادی کی شاعری کو ہندوستان کے مسلمانوں کے قلب کی گرمی قرار دیا ہے اور اکبر کو ایک خط میں لکھا ہے کہ ''میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے۔[۲۶]

اکبرالہ آبادی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے یہ باور کرایا کہ ہم مغربی تہذیب پر کتنی تنقید کیوں نہ کر لیں، ہمارے دلوں میں اگر کسی کی ہیبت طاری ہے تو وہ مغربی نظامِ فکر و تمدن ہے۔ اس تہذیب کی ہیبت کو تسلیم کرنے کے بعد ہماری ایمانیات کے بنیادی تصورات کم زور ہو رہے ہیں اور ہمیں کئی مواقع پر جواز تلاشنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمارا دانش ور طبقہ بھی تصور خدا، تصور کائنات، تصور انسان کے بارے میں مغربی تہذیب کی فکری یلغار کے نرغے میں دکھائی دیتا ہے۔ اس بات کو ہم مزید سمجھنا چاہتے ہیں تو چارلس ٹیلر (Charles Taylor) کی کتاب *A Secular Age* کو دیکھنا چاہیے جس میں وہ لکھتا ہے کہ مغربی فکر سے وابستہ افراد کی خواہش رہی ہے کہ مذہب یا تو سیکولرزم کی راہ سے ہٹ جائے یا پھر اس کا ہم رکاب ہو، تا کہ انسان مذہبی دھندے سے آزاد ہو کر عقل کی روشنی میں آگے بڑھ سکے۔ ٹیلر اسے جدیدیت کے ہم معنی قرار دیتا ہے۔ اس کا یہ خیال ہے کہ موجودہ دور سائنسی اسلوبِ فکر کا حامل ہے اور انسان اس فکر میں مکمل طور پر پیوست ہو جانا چاہتا ہے وہ صاف الفاظ میں کہتا ہے۔ ''اگر انسان کی راہ میں جھوٹے تو ہم پرستانہ عقائد اور بے معنی مابعدالطبعیات مزاحم نہ ہوں تو یہی کچھ چاہے گا''۔[۲۷]

مریدِ دہر ہوئے وضع مغربی کر لی
نئے جنم کی تمنا میں خود کشی کر لی[۲۸]

ناچ ہے مغرب کا بزمِ دہر میں
جھومتے ہیں مشرقی بیٹھے ہوئے

نام یوسف سے ہوا یعقوب کا
یوں حضرت کے بہت بیٹے ہوئے[۲۹]

اکبر نے اپنے مخصوص طنزیہ طریق کار سے جوان کی ذہنی اپچ سے مکمل ہم آہنگ تھا مغربی فکر کے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی جدوجہد اور کوششیں بے ثمر رہیں۔ نئی نسل کا رشتہ اپنی ایمانیات اور علمیت سے کم، بیرونی قدر و تہذیب سے زیادہ قریب ہے۔ نئی نسل کو نئے زمانے کی جدیدیت، لبرل ازم زیادہ تہذیب یافتہ اور نمو پرور دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے اکبر کے یہاں ''خود کلامیہ'' (Soliloquy) کی صورت حال دکھائی دیتی ہے:

ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش
لیڈیوں سے مل کر دیکھو ان کے انداز و طریق
ہال میں ناچو کلب میں جاکے دیکھو ان کے تاش
بادۂ تہذیبِ یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم
ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کر دو پاش پاش[۳۰]

شیشۂ تقوٰی کے پاش پاش ہونے کا عمل ہمارے معاشرے کے لیے صرف ایک خطرے کا نشان نہیں ہے بلکہ پورے سماج کے ڈھانچے پر ایک ایسی کاری وار کی سی حیثیت رکھتی ہے جس کی حساسیت کو محسوس کرنے والے آج بھی تڑپ اٹھتے ہیں۔ نئے ذہن اور مغربی تعلیم سے بہرہ مند نوجوان اکبر اور اقبال جیسے لوگوں کی باتوں کو ''ترقی'' کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ وہ شعوری طور پر اکبر الٰہ آبادی اور اقبال سے اغماض برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ اسلامی تہذیب کے تمام مظاہر سے لگاؤ رکھنا اور اس میں دل چسپی لینا مذاق کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ایسے مفکرین جو دور حاضر سے اعلان برات کر رہے ہیں وہ اصل میں Out dated ہیں۔

ہر رنگ کی باتوں کا مرے دل میں ہے جُھرمٹ
اجمیر میں کلچا ہوں علی گڑھ میں ہوں بسکٹ

پابند کسی مشرب و ملت کا نہیں ہوں
گھوڑا مری آزادی کا جاتا ہے بگٹٹ[۳۱]

نغمۂ قومی کا مطرب آج کل ہے ہر سٹی
تال ہے ذکرِ ترقی سم ہے یونی ور سٹی

دین کی الفت ان کے دلوں سے یوں ہی نہیں گر مٹی
مسلم اٹھ جائیں گے رہ جائے گی یونی ورسٹی[۳۲]

مسجدیں سنسان ہیں اور کالجوں کی دھوم ہے
مسئلہ قومی ترقی کا مجھے معلوم ہے[۳۳]

جنوبی ایشیا میں ظاہر ہونے والے اس نئے فکر کی، نئے انسانی روپ کے تقدیری اور اخلاقی تصور کا پہلا نقشہ اکبرالہ آبادی نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اس کے لیے مغربی علامات کی حسی کیفیات کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس نظام فکر کو اپنانے کے بعد مذہب سے بے گانگی ہمارا مقدر ٹھہرے گی۔ اکبر کی اس بات کو عالمی وبا کے تناظر میں دیکھیں تو اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ دور جدید کے دانش ورانہ میلانات کو نہایت باریک بینی کے ساتھ دیکھنے سے یہ گرہ مزید کھلتی ہے کہ طاقت کا ڈسکورس جغرافیائی اعتبار سے ایک خطے سے دوسرے خطے میں تبدیل تو ہوسکتا ہے لیکن مغرب کے نام نہاد آفاقی یا عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں تبدیلی اہل دنیا کی کسی تہذیب کو مقصود نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے نقائص پر اسلامی دنیا میں ردعمل ضرور ہے۔

عہد انگلش میں ہے ہر چیز کے اندر نمبر
کیا تعجب ہے جو نکلا ہے پیمبر نمبر[۳۴]

اکبر کے طنز ''حالی غزل کو چھوڑ مسدس پہ آرہے'' میں مابعد نوآبادیاتی تصور دیکھ سکتے ہیں۔ اس دور کے تخلیق کار جو ہم جیسے ملکوں میں رہنے والے ہیں وہ اب سانچے کے اعتبار سے پرانی روایت کو قبول کرنے کے بجائے مغرب سے اخذ شدہ اثرات قبول کرتے ہیں یعنی اب تخلیق کاری کی ساری ہیئتیں مغرب سے مستعار لی گئی ہیں مغربی انداز کو قبول نہ کیا جانا معیار کی سند نہیں پاسکتا۔[۳۵] کپلنگ کی نظم White Man's Burden میں ''سفید آدمی کے بوجھ'' کی اصطلاح سے لے کر Francis Fukuyama کی *The End of History and The Last Man?* میں جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس میں فوکویاما کہتا ہے کہ:

یہ سچ ہے کہ اسلام لبرل ازم اور کمیونزم کی طرح ایک ضابطہ حیات تشکیل دیتا ہے جس میں اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی نظریہ انصاف موجود ہے۔ اسلام کا یہ دعوٰی ہے کہ وہ ایک آفاقی قوت ہے جو فرد سے فرد تک پہنچ

رہا ہے اسلام کسی خاص نسلی گروہ کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے ہے اور واقعتاً اسلام نے مسلم دنیا میں لبرل جمہوریت کو شکست دی ہے آج بھی اسلامی دنیا لبرل انداز حکمرانی کے لیے ان ممالک میں براہ راست خطرہ ہے جہاں اس نے سیاسی اقتدار حاصل نہیں کیا ہے۔[۳۶]

اس نقطہ نظر کی تشریح کرنے کے بعد فوکویاما موجودہ صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

تقریباً ایک ارب کے قریب لوگ اسلامی تہذیب سے وابستہ ہیں جو دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے وہ اپنے ممالک میں بھی لبرل جمہوریت کو چیلنج نہیں کر رہے۔ لبرل ازم نے گزشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران متعدد بااثر مسلمان شخصیات کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لبرل نظریات کو اسلامی دنیا سے اتنا خطرہ نہیں جتنا اسلامی دنیا کو لبرل نظریات سے ہے۔[۳۷]

فوکویاما مزید کہتا ہے کہ:

تاریخ کے اختتام پر لبرل جمہوریت کے مقابلے میں کوئی طاقت ور نظریہ موجود نہیں۔ ماضی میں جن لوگوں نے لبرل جمہوریت کو رد کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بادشاہت، افسر شاہی، مذہبی حکومت، فاشزم، کمیونزم اور اس جیسے کسی نظریے پر یقین رکھتے تھے۔ اس وقت اسلامی دنیا کے علاوہ دنیا کی تقریباً تمام بڑی طاقتوں میں اتفاق پایا جاتا ہے کہ لبرل جمہوریت ہی حکومت کرنے کا بہترین عقلی اور عملی نظریہ ہے۔[۳۸]

ان اقتباسات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اکبر کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں شاید یا بلکہ یقیناً فوکویاما کی ان باتوں سے قبل اکبر نے مادّی دنیا کی مسلم دنیا میں نفسیاتی برتری کو پیش کر دیا تھا:

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے سامان بہم ہوں گے
بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال وسم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے
تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے[۳۹]

غزل کے ان اشعار سے ہمیں یہ اندازہ لگا لینا چاہیے کہ اکبر پر ماضی میں ہونے والی گفتگو صرف سیاسی جمالیات میں طنز کی گہرائی تک باریاب ہوئی۔ ہماری نام نہاد تنقید جو خود مغرب کی مابعد الطبعیات سے نکلی ہے وہ اکبر کے جملوں کی کاٹ چھانٹ، طنز کی نشتریت اور اس کی ذہانت کے خارجی پہلو تک محدود تھی اکبر نے اپنی شاعرانہ شعریت کے ذریعے جس تہذیب کو ڈوب کر دیکھا اس کی چمک دمک کا آج ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اکبر نے صرف مغرب کے پیدا کردہ انسان کے خصائص بیان نہیں کیے بلکہ Loss of Faith کی ہونے والی وجدانی تصویر ہو بہو ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔[۴۰]

اکبر کے اس وجدان نے انھیں ان تصاویر کی جھلکیاں بھی دکھائیں جس میں وہ دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ مغربی علم دوسروں پر انحصار کرنے کا رویہ سکھاتا ہے اس میں افکار و حقائق اور تخلیقی عناصر کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں تعلیم کا مطلب مغرب جیسا ہو جانا ہے۔ جو مغرب جیسا ہو جاتا ہے وہی کامیاب و کامران ہے لہٰذا علی گڑھ کی ناقدانہ تفہیم سے عاری تحریک کی طرح تیسری دنیا اب اس مرحلے پر پہنچ چکی ہے جس میں مغرب کی تہذیب و ثقافت کو نہایت عقیدت اور محبت کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔ اکبر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک نوجوان صبح سے شام تک مارکیٹ کے اخلاقی اصول کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے اور جب وہ خاندان میں لوٹے تو تجارتی اصول ترک کر کے دین داری کے اصول میں ڈھل جائے:

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے، فقط سرکاری ہے[۴۱]

پڑھ کے انگریزی میں دانا ہو گیا
"کم" کا مطلب ہی کمانا ہو گیا[۴۲]

کہاں کی پوجا نماز کیسی کہاں کی گنگا کہاں کا زم زم
ڈٹا ہے ہوٹل کے در پہ ہر اک ہمیں بھی دو ایک جام صاحب[۴۳]

اکبر نے یہ محسوس کیا کہ تعلیم، ترقی اور اصلاح کے نام پر مغربی سرمایہ دارانہ نظام پھیلاؤ اور استحکام حاصل کریں گی۔ اکبر نے اس نقطے کی ترویج و اشاعت کے لیے توپ، بسولا، رندا، انجن، بھاپ، کالج، اسکول جیسے الفاظ کو علامتی طور پر استعمال کیا ہے...... یہ تمام علامات خاص مابعد الطبعیاتی نظام رکھتی ہیں۔ ان الفاظ کے اپنے تصوراتی پیکر ہیں ان کا اپنا رویہ ہے جس کے نتیجے میں ہمارے ماحول اور تمدنی زندگی پر صحت مندانہ اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ طبقاتی نظام تشکیل پایا اور اعلیٰ انسانی قدریں جو ہزاروں سال کی فکر انسانی کی دانش کا نچوڑ تھیں انھیں رد کر دیا گیا۔ اکبر نے انسانی رشتے کی بحرانی کیفیت کو اپنی وجدان کی

سطح پر محسوس کیا۔ انھوں نے مغرب کی فکر کی مابعد الطبیعیاتی جہت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی شاعری کا کینوس تشکیل دیا ہے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ان چیزوں کے استعمال سے ہماری زندگی کی روحانی قدریں بھاپ بن کر ہوا میں تحلیل ہو جائیں گی۔[۴۴]

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور گر جائے گی بھاپ
دیکھنا اکبر بچائے رکھنا اپنے آپ کو[۴۵]

چگی ڈاڑھی والے اکبر کی وجدانی سطح محدود معاشرے کے لیے نہیں تھی بلکہ اس میں سماج کا ہر طبقہ شامل تھا۔ انھوں نے کورانہ تقلید کے خلاف ذکاوتِ حس سے لبریز ہو کر معاشرے میں برپا تضادات کو نمایاں کیا۔[۴۶]

کیا ذوق عبادت ہو ان کو جو مس کے لبوں کے شیدا ہوں
حلوائے بہشتی ایک طرف ہوٹل کی مٹھائی ایک طرف
مذہب کا تو وہ دم بھرتے ہیں بے پردہ بتوں کو کرتے ہیں
اسلام کا دعویٰ ایک طرف یہ کافر ادائی ایک طرف[۴۷]
تن رہے ہیں آپ فکرِ جاہ کے پتلون میں
میں گھلا جاتا ہوں فکر رزق کے افیوں میں[۴۸]

اکبرالٰہ آبادی اس لحاظ سے کامیاب ترین شاعر ہیں جنھوں پہلی بار یہ بتایا کہ انگریزی تعلیم ہماری تہذیبی روایت و اقدار کے لیے سامراجی اداروں کے قوت مند ہتھیار ہیں۔ وہ سامراجی تعلیمی اداروں کے تربیتی نظام سے اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ انسان کو بازاری اور عقل کو یقین سے خالی کر دیتا ہے۔ اس کے کئی مضمرات ان کے پیش نظر رہے۔

وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس نظام تربیت کہ نتیجے میں ایک نئی اخلاقیات جنم لیتی ہے جس میں فرد اپنی ذات کو اہمیت دیتا ہے۔ ذات میں سمٹنے کا عمل کسی ایک مقام پر نہیں رکتا۔ یوں سمجھ لیں کہ زندگی کے تمام تار پود بکھر جاتے ہیں۔ اکبر کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ جدید طریقہ تعلیم انسان کو روحانی طور پر مضمحل اور بے چین رکھتا ہے۔ استعماری فکر کا منشا یہ تھا کہ محکوموں کی ایک ایسی فوج تیار کی جائے جو ہمارے نظامِ فکر کے ماتحت اپنی زندگی بسر کر سکے۔[۴۹] اس سوچ کو عوام الناس تک پہنچانے کے لیے اکبر نے مخصوص کرداروں اور علامتوں کا سہارا لیا۔ انھوں نے یہ ثابت کیا کہ اگر کسی فن کار کے پاس اس کا اپنا نقطہ نظر اور اپنے پیمانے ہوں تو اس کا فکری بیان مؤثر ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ایسے الفاظ برتے جس نے ان کے مطمح نظر کو

واضح کیا۔ یہ تمام الفاظ ایک خاص ماحول اور فکر سے وابستہ ہیں۔ جس پر مغرب کی تاریخ، تہذب کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ اگر ہم ان کے تقاضوں کو پورا کرنے لگ جائیں تو لا محالہ ہمیں اپنے نظامِ اخلاق و اقدار کی دیواروں کو منہدم کرنا ہوگا۔ اکبر نے اس منہدم شدہ روایت کی مصوری ہی تو کی ہے بس سہارا اشیاء کا لیا ہے جو ہمارے معمولاتِ زندگی کا حصہ بن گئی ہیں۔

حقیقت میں اکبر کی زبان میں روحِ مشرق کی تابندہ زندگی اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کی تنقید اور عزم و حوصلے نے مغربی استعمار کے خلاف ہمیں صرف فہم عطا نہیں کیا بلکہ اس بات کی گواہی دینے پر مجبور کیا ہے کہ استعماری طاقت کے سامنے بھی حق اور سچ کو بغیر کسی تاویل کے بیان کرنا چاہیے۔ انھوں نے ہمیں پہلی بار بتایا کہ مغربی معیارات انسانی ذہن کی ایسی تشکیلِ نو کرتا ہے جس سے عقیدے کو زک پہنچتی ہے تخلیقی عمل بانجھ پن کا شکار ہوتے ہیں۔ فاتح علم مفتوح ذہنوں کو تعبیرات کی گنجلک دنیا کا اسیر بنا دیتا ہے۔ ڈارون کا ارتقائی حیوان اور مارکس کا معاشی حیوان دراصل مغرب کا انسان ہے۔ اس طرح اہل مغرب کی نفسیات، معاشیات، حیاتیات، عمرانیات اور انسانیات مغربی انسان کی تعمیم کے سوا کچھ نہیں۔ یہ بندروں کی صرف قیاس آرائی ہے انسان ہمارے جیسے ہی ہوتے ہیں۔[۵۰]

ڈارون صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے
میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے[۵۱]

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی
چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر
پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی[۵۲]

پردے کا شوق نہ مجھے فکرِ حور ہے
کالج سے ہے نجات تو ذکرِ حور ہے[۵۳]

پڑ پڑ پر شیخ جی پکارے کہ ہم تو مطیع رب ہیں
کہا کسی نے یہ مسکرا کر بڑے میاں تو بڑے غضب ہیں
گریجویٹ ایک بڑھ کے بولا پروا کریں نہ ان کی
ضعیف و خستہ، خراب و رسوا یہ مہمان دو چار شب ہیں[۵۴]

اکبر کا زمانہ مشرق و مغرب کے امتزاج کا تھا۔ ایک پوری تہذیب کی بساط لپیٹی جارہی تھی۔ اکبر ان عوامل پر غور کرتے رہے کہ علم میں تنوع اور تبدیلی کے نام پر ہمارے اعتماد اور یقین کو داخلی اور خارجی

نارسائی کے عمل سے دوچار کیا جا رہا ہے۔ سامراجی اقتدار سیاسی بالا دستی حاصل کر کے تہذیبی تصادم کی صورت حال اختیار کر جائے گا۔ اب ہم ایک ایسی تہذیبی زندگی بسر کریں گے جس میں روح جسم سے، باطن ظاہر سے، اصل نقل سے، روحانیت مادیت سے اور آخرت دنیا سے زیادہ اہمیت رکھتی ہوگی۔[۵۵]

غرض اکبر الٰہ آبادی کا مطالعہ کریں تو ہمیں عہد حاضر میں ہونے والے تہذیبی تصادم کے جوابات نہایت عمدگی سے مل سکتے ہیں۔ انھوں نے نہایت سادہ انداز میں یہ بتایا کہ مغربی نظام کے برعکس اگر تمام انسانیت مساوات پر مبنی عالمی نظام کی خواہاں ہے تو اسے اسلام کی آفاقی اور نظری اقدار کی جانب قدم بڑھانا ہوگا۔ اسلام ہی اکبر کے نزدیک تمام کرۂ ارض کے لیے امن وسکون اور ہم آہنگی کا نمونہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کا سوادِاعظم اب بھی اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے، مسلمان رہنا چاہتا ہے لیکن دماغ مغربی افکار اور مغربی تہذیب سے متاثر ہے۔ فوکویاما کی بات درست معلوم ہوتی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ مغرب نے اسلامی دانش وروں کو متاثر کیا ہے جس کی وجہ سے وہ اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں اور یہ انحراف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ سیاسی غلبے کی مختلف صورتوں کے برعکس اسلامی دنیا میں مغرب کا علمی اور فکری تسلط نمایاں ہے جس نے نگاہوں کے زاویے اس طرح تبدیل کر دیے کہ دیکھنے والوں کے لیے مسلمان کی نظر سے دیکھنا مشکل ہو گیا، سوچنے والوں کے لیے اسلامی طریق سے سوچنا مشکل ہو گیا۔[۵۶] اکبر اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے صاف کہتے ہیں کہ ہم مسلمان اس تہذیب سے کلیتاً اعلان برات کریں۔ کیوں کہ تہذیب کا وجود منحصر اس بات پر ہے کہ عقیدہ اور عمل کا اس نے جو نظام وضع کیا ہے اس کو ماننے والے اس کی مکمل پابندی کریں۔ جب ماننے والے اس نظام سے باہر کے تصورات اور طور طریقوں کو اپنائیں گے ذہن و دل میں اس کی قبولیت کی گرہ کو مضبوط کر لیں گے تو پھر تہذیب کا وجود باقی نہیں رہے گا۔[۵۷] اکبر کہتے ہیں کہ

گو رک نہیں سکتی یہ نقل وضع مغربی
پھر بھی کامل طور پر ممکن نہیں ہم قالبی
اپنی تاریخ اپنی ملت سے رہو تم باوفا
بندگی تم کو مبارک صاحبوں کو صاحبی[۵۸]

اس مضمون کا مقصد منتخب روزگار افراد کے دانش مندانہ پہلوؤں کو ایک بار پھر ماضی کی جانب منتقل کرنا ہے تاکہ جنوبی ایشیا میں ہمارے تہذیبی روایتی ورثے کی تشکیل نو کی ترغیب وتحریک پیدا ہو سکے۔ مسلم دانش وروں نے جس طرح نئی تہذیبی تشکیل کو اسلامی دنیا میں مصلحت کے تحت قبول کیا اس نے جدید ترین ذہن کو محض کمیوں، تضادات اور ابہامات کی طرف نہیں دھکیلا بلکہ مغرب کی دانش ورانہ بنیادوں میں پائی

جانے والے تضادات کی نوعیت کو آشکار بھی نہیں کیا۔

اکبر کا کمال یہ ہے کہ اس نے سماجی اور تہذیبی زندگی کو روایت سے بندھا ہوا پیش کیا۔ اس کی روحانی قوت کو آشکار کیا۔ اس کی فطری سادگی کو نمایاں کیا اور نہایت تفتیشی نکات کے ذریعے اپنی شاعری میں پیش کر دیا۔ ان نکات کی کہانیوں کو علمی سطح پر لانا ہماری دانش ورانہ زندگی کے لیے مفید ہے۔ جن مغربی تنقید نگاروں اور تاریخ نویسوں نے اکیسویں صدی میں ساتھ مل کر چلنے اور دنیا کو چلانے کا اعلان کیا تھا ان کی تہذیبی قوت آج شدید ترین بحران سے دوچار ہے۔ اس بحران کو مناسب انداز میں دیکھنے اور زبان سے بیان کرنے کے لیے اکبر کی شاعری سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

ہم نشیں کہتا ہے کچھ پروا نہیں مذہب گیا
میں یہ کہتا ہوں کہ بھائی یہ گیا تو سب گیا[۵۹]

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ۱۹۶۰ء میں پرتاب گڑھ میں اکبرالٰہ آبادی سے ملاقات کی......تو اکبر نے ان سے پوچھا! کہ آپ میرے کلام کے اتنے دل دادہ ہیں تو اس میں کیا بات ہے۔ فارسی زبان کو سامنے رکھیے کتنے ذہین اور قابل شاعر اس میں پیدا ہوئے لیکن دنیا نے یاد دو ہی چار کو رکھا...... یہی شیخ سعدی اور مولانا رومی۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ان سے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے کو مٹا کر خدا کی یاد تازہ رکھنی چاہی، اس حیّ وقیوم نے انھیں ایسی زندگی بخش دی۔[۶۰]

❁.....❁.....❁

حوالہ جات وحواشی

۱- جالبی، ڈاکٹر جمیل، معاصر ادب، ۱۹۹۶ء، دہلی، ص۱۶۴
۲- سلیم احمد، غالب کون، ۱۹۷۱ء، یکے از مطبوعات المشرق، کراچی، ص۱۰۷
۳- فاروقی، شمس الرحمٰن، اکبر الٰہ آبادی: نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار، ۱۴واں ذاکر حسین یادگاری لیکچر، نئی دہلی، ص۱۰
۴- ساحل احمد، رقعات اکبر الٰہ آبادی، ۱۹۹۷ء، اردو رائٹرس گلڈ الٰہ آباد، ص۲۱
۵- فاروقی، شمس الرحمٰن، ص۱۰
۶- ایضاً
۷- لیسٹر پیئرسن (Lester Pearson)، *Democracy in Politics*، ۱۹۵۵ء، پرسٹن یونی ورسٹی پریس،

ص ۸۳-۸۴

۸- ہنٹنگ ٹن، سیموئل (Samuel P. Huntington)، *Clash of Civilizations*، 2003ء، اردو ترجمہ: سہیل انور، آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ص ۹۲-۹۳

۹- ایضاً، ص ۹۳

۱۰- ایضاً

۱۱- ساحل احمد، ص ۱۲۶

۱۲- اکبرالہ آبادی، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، جلد اوّل، سن ندارد، شائع بزم اکبر، کراچی، ص ۲۹۰

۱۳- مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، ۲۰۰۴ء، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ص ۱۲

۱۴- ڈیکارٹ، رینے (Rene Descartes)، *Meditations on First Philosophy*، 1996، انگریزی ترجمہ: الزبتھ ایس ہالڈین (HaldaneS. Elizabeth)، کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ص ۱۲

۱۵- حسن عسکری، جدیدیت، ۱۹۹۷ء، ادارہ فروغ اسلام، لاہور، ص ۵۳

۱۶- اکبرالہ آبادی، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، جلد اوّل، ص ۲۰۱

۱۷- ایضاً

۱۸- ایضاً

۱۹- اکبرالہ آبادی، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، جلد اوّل، ص ۴۳۷

۲۰- ایضاً، ص ۱۳۳

۲۱- اکبرالہ آبادی، نثر اکبر الٰہ آبادی، مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ۲۰۰۸ء، مجلس ترقی ادب لاہور، ص ۳۸

۲۲- ایضاً، اکبر الٰہ آبادی کے لطیفے، مرتبہ: نادم سیتاپوری، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ص ۱۳

۲۳- پپن، رابرٹ (Robert pippin)، *Modernity as a Philosophical Problem*، کیمبرج بیسل بلیک ویل، ص ۸۱

۲۴- ولیمز، ڈیوکن (Ducan Williams)، *Trousered Apes- Sick literature in a sick Society*، ۱۹۷۲ء، ڈیل پبلشنگ کو، نیویارک، ص ۸

۲۵- طارق جان، سیکولرازم مباحث اور مغالطے، ۲۰۱۲ء مترجم: محبّ الحق صاحب زادہ، ایمل مطبوعات، اسلام آباد، ص ۱۲۵

۲۶- علامہ اقبال، کلیات مکاتیب اقبال، جلد اول، مرتبہ: سید مظفر حسین برنی، ۱۹۸۹ء، اردو اکادمی دہلی، ص ۲۲۶؛ اقبال اکبرالہ آبادی کو مزید لکھتے ہیں کہ ''مسلمان اس قلب کی گرمی سے متاثر ہو، جو خدا نے آپ کے سینے میں رکھا ہے۔

۲۷- چارلس ٹیلر، (Charles Taylor)، ?*A Secular Age*، ۲۰۰۷ء، کیمبرج، ہارورڈ یونی ورسٹی پریس، ص ۵۷۰-۵۷۱

۲۸- اکبرالہ آبادی، اکبر الٰہ آبادی، جلد دوم، ۱۹۵۴ء، بزم اکبر کراچی، ص ۴۵

۲۹- ایضاً، ص ۵۱

۳۰- اکبرالہ آبادی، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، جلد اوّل، ص ۲۹۴

۳۱- ایضاً، ص ۴۰۳

۳۲- اکبر الٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، جلد دوم، ص ۱۴۲
۳۳- ایضاً، ص ۱۴۵
۳۴- ایضاً، ص ۸۱
۳۵- پیٹر بیری، (Peter Beary)، Bigining Theory، اردو ترجمہ: الیاس بابر اعوان، 'بنیادی تنقیدی تصورات'، عکس، لاہور، ص ۲۱۲
۳۶- فرانسس فوکویاما، (Francis Fukuyam)، *The End of History and The Last Man?* 1992ء، فری پریس نیویارک، ص ۴۵-۴۶
۳۷- ایضاً، ص ۴۶
۳۸- ایضاً، ص ۲۱۱-۲۱۲
۳۹- اکبر الٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، جلد اوّل، ص ۲۰۷-۲۰۸
۴۰- جوہر، محمد دین، ''ن م راشد کبیدہ تہذیب کا شاعر''، مشمولہ: سہ ماہی جی، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۱۱۶
۴۱- اکبر الٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، ۱۹۵۴ء، جلد دوم، سوم، بزم اکبر کراچی، ص ۴۵۱
۴۲- ایضاً، ص ۷۶
۴۳- ایضاً، ص ۱۲۵
۴۴- سجاد، باقر رضوی، اکبر اور ہندی مسلمانوں کی تہذیب، ۱۹۵۰ء، مشمولہ: 'علی گڑھ میگزین'، اکبر الٰہ آبادی نمبر، شمارہ ۳۴، علی گڑھ، ص ۱۴
۴۵- اکبر الٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، جلد اوّل، ص ۲۵۰
۴۶- زکریا، خواجہ محمد، اکبر الٰہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ۲۰۰۳ء، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۶
۴۷- اکبر الٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، ۱۹۵۴ء، جلد دوم، سوم، بزم اکبر کراچی، ص ۱۸
۴۸- ایضاً، ص ۴۱۳
۴۹- عرفان، سید اختر، اکبر الٰہ آبادی کا سنجیدہ کلام، مشمولہ: علی گڑھ میگزین، اکبر الٰہ آبادی نمبر، شمارہ ۳۴، علی گڑھ ۱۹۵۰ء، ص ۸۵
۵۰- سلیم احمد، غالب کون، ۱۹۷۱ء، یکے از مطبوعات المشرق، کراچی، ص ۱۰۵-۱۰۶
۵۱- اکبر الٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، جلد اوّل، بزم اکبر کراچی، ص ۲۱۸
۵۲- ایضاً، ص ۳۹۲
۵۳-
۵۴- اکبر الٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، ۱۹۵۴ء، جلد دوم، سوم، بزم اکبر کراچی، ص ۸۷
۵۵- صدیقی، رشید احمد، اکبر پر ایک نظر، مشمولہ: علی گڑھ میگزین، اکبر الٰہ آبادی نمبر، شمارہ ۳۴، علی گڑھ ۱۹۵۰ء، ص ۴
۵۶- مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، ص ۱۵
۵۷- مودودی، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ۱۹۹۷ء، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ص ۸۴

۵۸- اکبرالٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، جلداوّل، بزم اکبر کراچی، ص۲۵۵

۵۹- ایضاً، ص۲۷۳

۶۰- صدیقی، رشید احمد، اکبر پر ایک نظر، مشمولہ: علی گڑھ میگزین، اکبرالٰہ آبادی نمبر، شمارہ ۳۴، علی گڑھ ۱۹۵۰ء، ص۵